ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2628

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ

(شعبۂ فکرِ اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: فلسفہ اور علم الکلام (2628)

سطح: ایم اے علومِ اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2025ء

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر 5–9)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 40

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعے اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ متعلقہ یونٹس کا خود مطالعہ کریں، مفاہیم کو سمجھیں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1: اسلامی تصورِ الٰہ کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ (20)

تعارف

خدا کا تصور ہر مذہب اور فلسفے کی بنیاد ہوتا ہے، کیونکہ اسی سے کائنات، انسان، اخلاق اور آخرت کے تمام تصورات جڑے ہوتے ہیں۔ اسلام نے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اپنی جامعیت، توازن اور وضاحت کی وجہ سے نمایاں خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ نہ تو اسے تجسیم کی طرف جاتا ہے کہ خدا کو مخلوق جیسا بنا دیا جائے اور نہ تعطیل کی طرف کہ اسے ایک بے معنی مجرد خیال بنا دیا جائے۔ اس کے مرکزی نکات توحید، تنزیہ و کمال، خالقیت و ربوبیت، علم، قدرت کی وسعت، رحمت و عدل کا اجتماع اور انسان سے قرب ہیں۔ اس جواب میں ان خصوصیات کو الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا جائے گا اور جہاں مناسب ہو دوسرے تصورات سے مختصر تقابل بھی کیا جائے گا تاکہ امتیاز پوری طرح واضح ہو۔ یہ بحث تعلیمی و علمی ہے؛ اعتقادی جزئیات میں رہنمائی مستند اہل علم سے لینا ہی درست طریقہ ہے۔

اسلامی تصور الٰہ کو سمجھنے کا بنیادی ماخذ قرآن و سنت ہے۔ فلسفہ اور علم الکلام نے اس تصور کی عقلی وضاحت، اس پر اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور اس کی اصطلاحات کی تنظیم کی ہے، مگر بنیاد وحی ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تصور میں عقلی استدلال اور نقلی ہدایت دونوں کو دخل ہے۔ عام انسان بھی اس تصور کو سادہ الفاظ میں سمجھ سکتا ہے کہ اللہ ایک ہے، سب کا خالق و مالک ہے، ہر کمال اس کے لیے ثابت ہے، وہ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس سادگی کے ساتھ ساتھ اس میں اتنی گہرائی بھی ہے کہ صدیوں سے متکلمین و فلاسفہ اس پر غور کرتے آ رہے ہیں۔ یہ اجتماع سادگی و گہرائی خود اس تصور کی ایک امتیازی خوبی ہے۔

توحید: وحدانیت کی جامعیت

اسلامی تصور الٰہ کی سب سے پہلی اور بنیادی خصوصیت توحید ہے۔ اللہ ذات میں ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، نہ اس کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ توحید صرف ایک عددی دعویٰ نہیں؛ اس کے تین بڑے پہلو تعلیمی طور پر بیان کیے جاتے ہیں۔ توحید ربوبیت کہ کائنات کا خالق، مالک اور مدبر ایک ہی ہے۔ توحید الوہیت کہ عبادت، دعا اور آخری اطاعت کا مستحق صرف وہی ہے۔ اور توحید اسماء و صفات کہ اس کے نام و صفات میں بھی وہ یکتا ہے۔ اس جامع توحید کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کی

وفاداریاں بٹتی نہیں؛ وہ خوف، امید، محبت اور اطاعت کا مرکز ایک ہی ذات کو بناتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جہاں کئی دیوتاؤں یا خود مختار قوتوں کا تصور ہوتا ہے وہاں انسانی زندگی میں بھی انتشار پایا جاتا ہے۔ توحید انسان کو فکری وحدت کے ساتھ اخلاقی وحدت بھی عطا کرتی ہے۔

توحید کی یہی خصوصیت اسلام کو خداؤں کی کثرت والے مذاہب سے اور اس مادہ پرست فکر سے بھی ممتاز کرتی ہے جو کسی خالق کو ہی نہیں مانتی۔ مسلم متکلمین نے توحید پر بڑے مضبوط عقلی دلائل قائم کیے ہیں، مثلاً اگر دو قادر مطلق فرض کیے جائیں تو نظامِ کائنات کے انتظام میں اختلاف کا امکان پیدا ہوتا ہے جبکہ کائنات کا نظم ایک ہی مدبر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ دلائل اس گائیڈ میں خلاصے کے طور پر بیان کیے گئے ہیں؛ ان کی تفصیلی علمی بحثیں نصابی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلامی توحید محض فلسفیانہ نظریہ نہیں بلکہ زندگی کا عملی مرکز ہے۔ کلمہ طیبہ کی یہی وحدانیت مسلمان کے اخلاق، معیشت اور ساست سب کو ایک محور پر رکھتی ہے اور اسے شرک کی ہر خفی و جلی صورت سے بچنے کی تلقین کرتی ہے۔

تنزیہ کے ساتھ صفات کا اثبات

دوسری امتیازی خصوصیت تنزیہ اور اثبات کا توازن ہے۔ قرآن کا اصول ہے کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں اور ساتھ ہی وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اس اصول میں دو باتیں جمع ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ مخلوق کی شکل، جسم، مکان اور حدود سے پاک ہے؛ اسے انسان یا کسی مخلوق کی صورت میں سمجھنا اس کی شان کے خلاف ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے کمالات حقیقی ہیں؛ اس کا علم، قدرت، حیات، ارادہ اور کلام محض استعارے نہیں ہیں۔ تاریخِ فکر میں کچھ گروہوں نے تنزیہ میں غلو کر کے صفات ہی کو مجاز بنا دیا اور کچھ نے اثبات میں غلو کر کے تشبیہ کا راستہ اختیار کیا۔ اسلامی تصور کا امتیاز اس اعتدال میں ہے جس کی تفصیل اگلے سوال میں اہل سنت کے منہج کے تحت بھی آئے گی۔ یہاں اتنا واضح کرنا کافی ہے کہ یہ توازن عام مومن کو خدا کے تصور میں الجھن سے بھی بچاتا ہے اور اسے ایک زندہ، قادر اور رحیم ذات سے جوڑے بھی رکھتا ہے۔

جدول: اسلامی تصورِ الٰہ کی امتیازی خصوصیات کا خلاصہ

خصوصیت	مفہوم	اثر

فکری واخلاقی وحدت	ذات، ربوبیت، عبادت وصفات میں وحدت	توحید
اعتدال، الجھن سے نجات	مخلوق سے مشابہت کی نفی، کمالات کا اثبات	تنزیہ واثبات
اسباب کے پیچھے اصل اسم	تخلیق، رزق اور تدبیر اسی کے ہاتھ میں	خالقیت وربوبیت
نگرانی وجواب دہی کا احساس	ہر چیز کا احاطہ، کوئی عاجزی نہیں	علم وقدرت کی وسعت
امید وخوف کا توازن	بے پایاں رحمت کے ساتھ کامل انصاف	رحمت وعدل
ذاتی تعلق وسکون	دعا کی سماعت اور بندوں سے قرب	قرب واجابت

اس توازن کی ایک عملی علامت اسلامی فن وتہذیب میں بھی نظر آتی ہے۔ اسلام میں خدا کی تصویر یا مجسمہ نہیں بنایا جاتا، کیونکہ اس کا کوئی مادی تصور ممکن ہی نہیں۔ اس کے بجائے خطاطی اور اسماء الٰہی کی کتابت نے فن کی صورت اختیار کی۔ یہ محض فن کاری کا فرق نہیں بلکہ تصور الٰہ کی تنزیہ کا تہذیبی اظہار ہے۔ اسی طرح مسجد کی سادگی بھی اسی فکر کی عکاس ہے کہ عبادت کا مرکز کوئی صورت نہیں بلکہ وہ ذات ہے جو ہر صورت سے بلند ہے۔ طالب علم کے لیے یہ مثال مفید ہے کیونکہ اس سے وہ دیکھ سکتا ہے کہ ایک اعتقادی تصور کس طرح پوری تہذیب کی صورت گری کرتا ہے اور فلسفہ وکلام کے مباحث کس طرح عملی زندگی میں ڈھلتے ہیں۔

خالقیت، ربوبیت اور جامع علم وقدرت

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی تصور میں خدا صرف کائنات بنا کر الگ ہو جانے والا خالق نہیں بلکہ ہر لمحہ اس کا رب، رازق اور مدبر بھی ہے۔ وہی زندگی وموت دیتا ہے، وہی رزق کے اسباب چلاتا ہے اور اسی کے علم سے کوئی ذرہ باہر نہیں۔ اس کا علم ماضی، حال اور مستقبل سب کو محیط ہے اور اس کی قدرت ہر ممکن پر غالب ہے۔ اس تصور سے دو بڑے فلسفیانہ مسائل کا رخ متعین ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کائنات خود کفیل مادی نظام نہیں بلکہ ہر پل اپنے خالق کی محتاج ہے، اس لیے اسباب کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی مومن کا

آخری اعتماد اسباب پر نہیں رب الاسباب پر ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ نہ معلوم ہونے والی کوئی گوشہ زندگی نہیں، اس لیے اخلاقی ذمہ داری اور اخروی جواب دہی کا تصور مکمل طور پر منطقی بنیاد پاتا ہے۔

اس خصوصیت کا انسانی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس شخص کو یقین ہو کہ اس کا رب اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ضروریات جانتا ہے اور اس کی دعا سنتا ہے، وہ تنہائی، مصیبت اور ظلم کے مواقع پر مایوسی کا شکار کم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ یقین اسے ظلم پر بدلہ لینے سے بھی روکتا ہے کیونکہ چھپی ہوئی جگہ بھی نگرانی سے خالی نہیں۔ اس طرح تصور الٰہ صرف ایک نظری عقیدہ نہیں رہتا بلکہ کردار سازی کی قوت بن جاتا ہے۔ مغربی فکر میں جہاں بعض فلسفیوں نے خدا کو کائنات سے الگ ناظر یا پہلا محرک کہہ کر چھوڑ دیا، اسلامی تصور میں اس کی فعال ربوبیت برقرار رہتی ہے۔ یہی فعالی اس تصور کو عملی زندگی سے جوڑے رکھتی ہے اور دعا، توکل اور شکر جیسے اعمال کو بامعنی بناتی ہے۔

رحمت و عدل کا اجتماع اور انسان سے قرب

چوتھی خصوصیت رحمت و عدل کا اجتماع ہے۔ اللہ کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے، وہ توبہ قبول کرتا ہے، خطائیں معاف کرتا ہے اور اپنے بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اسی کے ساتھ وہ کامل عادل ہے؛ ظالم اور مظلوم اس کے ہاں برابر نہیں ہو سکتے اور ہر عمل کا حساب ہوگا۔ صرف رحمت کا تصور بے خوفی و لاپروائی پیدا کر سکتا ہے اور صرف قہر و عدل کا تصور مایوسی پیدا کر سکتا ہے۔ اسلام دونوں کو جمع کر کے امید و خوف کا وہ توازن پیدا کرتا ہے جو اخلاقی زندگی کی اصل قوت ہے۔ اسی توازن سے جزا و سزا اور آخرت کا تصور بھی جڑا ہوا ہے کہ دنیا کی نامکمل عدالت آخرت کی کامل عدالت سے مکمل ہوگی۔ مظلوم کی آخری امید اور ظالم کی آخری وارننگ اسی عقیدے میں ہے۔

پانچویں خصوصیت خدا کا انسان سے قرب ہے۔ اتنی بلند و برتر ذات کے باوجود اسلام سکھاتا ہے کہ اللہ بندے سے بہت قریب ہے، اس کی دعا سنتا ہے اور اسے کسی واسطے کا محتاج نہیں بناتا۔ عبادت اور دعا میں بندہ براہ راست اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس قرب نے مذہبی زندگی میں کسی انسانی طبقے کی اجارہ داری کو ختم کر دیا اور ہر فرد کو براہ راست ذمہ دار و معزز بنایا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصور الٰہ نہ وہ فاصلہ رکھتا ہے جو انسان کو بیگانہ کر دے اور نہ وہ بے تکلفی سکھاتا ہے جو ادب ختم کر دے۔ تعظیم و

محبت کا یہ امتزاج عبادت کی روح ہے۔ ان تمام خصوصیات کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصور الٰہ ایک ہی وقت میں عقلی طور پر منظم، روحانی طور پر زندہ اور اخلاقی طور پر نتیجہ خیز ہے، اور یہی اس کا اصل امتیاز ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تصور الٰہ کی امتیازی خصوصیات میں جامع توحید، تنزیہ و اثبات صفات کا اعتدال، دائمی خالقیت و فعال ربوبیت، محیط علم و کامل قدرت، رحمت و عدل کا اجتماع اور بندوں سے قرب و اجابت شامل ہیں۔ ان خصوصیات نے خدا کو نہ مخلوق کی صورت میں محدود کیا اور نہ انسان سے بیگانہ کوئی مجرد خیال بنایا۔ اسی تصور نے اسلامی تہذیب کے علم، فن، اخلاق اور قانون کو صدیوں تک سمت دی ہے۔ طالب علم کے لیے اس سوال کا حاصل یہ ہے کہ وہ ان خصوصیات کو الگ الگ نعروں کے بجائے ایک مربوط نظام کی صورت میں سمجھے، کیونکہ انہی کے مجموعے سے وہ تصویر بنتی ہے جسے قرآن و سنت نے پیش کیا ہے۔ اعتقادی جزئیات میں مزید گہرائی کے لیے نصابی کتاب اور مستند اہل علم سے رجوع اس مطالعے کی تکمیل ہے۔

سوال نمبر 2: صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں اہلِ سنت کا منہج مختصراً بیان کیجیے۔ (20)

تعارف

صفات باری تعالیٰ کا مسئلہ علم الکلام کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کے لیے علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، کلام اور ارادہ جیسی صفات بیان ہوئی ہیں اور ساتھ بعض ایسی تعبیرات بھی آئی ہیں جن کے ظاہری مفہوم کو لے کر تاریخ میں اختلاف پیدا ہوا۔ سوال یہ تھا کہ ان صفات کو کس طرح سمجھا جائے کہ نہ اللہ کو مخلوق جیسا بنا دیا جائے اور نہ اس کی صفات کا انکار یا ایسی تاویل کر دی جائے کہ ان کا مفہوم ہی ختم ہو جائے۔ اہل سنت والجماعت نے اس نازک مسئلے میں ایک اعتدال والا منہج اختیار کیا جس کا خلاصہ اس جواب میں بیان کیا جائے گا۔ یہ بیان تعلیمی ہے؛ منہج کے جزئی اطلاق اور اختلافی صورتوں میں حتمی ترجیح مستند اہل علم کا کام ہے۔

منہج کو سمجھنے سے پہلے اس تاریخی پس منظر کا اشارہ مفید ہے جس میں یہ منہج تشکیل پایا۔ ابتدائی دور میں بعض گروہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق جیسی صورتوں کا رجحان اختیار کیا جسے تشبیہ کہا گیا۔ اس کے رد عمل میں معتزلہ وغیرہ نے صفات کو ذات سے الگ حقیقت ماننے سے گریز کیا اور بہت سی صفات کی تاویل اس انداز میں کی کہ کئی مفسرین و محدثین کے نزدیک اصل مفہوم مجروح ہونے لگا۔ اس صورت کو تعطیل سے قریب سمجھا گیا۔ اہل سنت کے ائمہ نے قرآن و سنت کی نصوص کو سامنے رکھ کر درمیانی راہ اختیار کی۔ اس راہ کی حفاظت امام ابو الحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی اور محدثین و فقہا کی بڑی روایت نے کی۔ اگلے عنوانات میں اس منہج کے اصول ایک ایک کر کے بیان کیے جائیں گے۔

منہج کا اصل اصول: اثبات بلا تشبیہ، تنزیہ بلا تعطیل

اہل سنت کے منہج کا مرکزی قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جو صفات قرآن و سنت سے ثابت ہیں انہیں ثابت مانا جائے، ان کی کیفیت میں مخلوق سے مشابہت کی نفی کی جائے اور انہیں معطل بھی نہ کیا جائے۔ خلاصہ اس مشہور اصول میں بیان کیا جاتا ہے کہ اثبات بلا تمثیل اور تنزیہ بلا تعطیل ہو۔ یعنی نہ یہ کہا جائے کہ اللہ کا علم انسان کے علم جیسا ہے اور نہ یہ کہا جائے کہ علم سے مراد کچھ اور ہے جس سے صفت کا مفہوم ہی ختم ہو جائے۔ اللہ کا علم کامل، ازلی اور ہر چیز کو محیط ہے جبکہ انسان کا علم حادث، محدود اور وسائل کا محتاج ہے۔ نام کا اشتراک حقیقت کی یکسانی کو لازم نہیں کرتا۔ شیر اور انسان دونوں کو زندہ کہا جاتا ہے مگر زندگی کی حقیقت دونوں میں ایک جیسی نہیں؛ خالق و مخلوق کے فرق میں یہ بات بطریق اولیٰ سمجھی جا سکتی ہے۔

اس اصول کی بنیاد خود قرآن کی وہ رہنمائی ہے جس میں ایک طرف اللہ کی مثل ہونے کی نفی ہے اور دوسری طرف اس کے سمیع و بصیر ہونے کا اثبات ہے۔ اہل سنت نے اسی جمع کو منہج بنایا۔ انہوں نے کہا کہ نفی و اثبات دونوں کو ساتھ رکھے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ صرف نفی پر زور دیا جائے تو ذات ایک نامعلوم خیال بن جاتی ہے اور صرف ظاہری اثبات پر تشبیہ سے بچا جائے تو اس کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ اس توازن کی حفاظت کے لیے اہل سنت نے نصوص کو ان کے سیاق میں پڑھنے، عربی زبان کے اسالیب کو سمجھنے اور

سلف کے فہم کو ترجیح دینے پر زور دیا۔ اس طریقے سے عام پڑھنے والے کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ لفظ کا نہیں، لفظ کے پیچھے موجود مخلوق سے مشابہت کے تصور کو دور کرنے کا ہے۔

کیفیت کی تفویض اور تاویل کی حدود

اہل سنت کے منہج کا دوسرا اہم پہلو کیفیت کے بارے میں موقف ہے۔ علم، قدرت وغیرہ کی اصل حقیقت اور کیفیت انسان کے ادراک سے بلند ہے، اس لیے ان کی کیفیت کو اللہ کے علم پر چھوڑا جاتا ہے۔ روایتی تعبیر میں اسے بلا کیف کہنا کہا جاتا ہے کہ صفت ثابت ہے مگر اس کی کیفیت مخلوق کی کیفیت جیسی نہیں اور اسے بیان کرنے کا دعویٰ بھی نہیں کیا جاتا۔ اس موقف کا مقصد تحقیق کو روکنا نہیں بلکہ تحقیق کو اس کی حد میں رکھنا ہے۔ جہاں نصوص نے بات کی ہے وہاں گفتگو ہو سکتی ہے اور جہاں انہوں نے کیفیت نہیں کھولی وہاں قیاس آرائی سے بچا جاتا ہے۔ اسی اصول نے امت کو بہت سے غیر ضروری جھگڑوں سے بھی محفوظ رکھا۔

جدول: صفات کے باب میں اہم مناہج کا تقابل

منہج	بنیادی رجحان	اہل سنت کا جائزہ
تشبیہ	صفات کو مخلوق جیسی سمجھنا	مردود، تنزیہ کے خلاف
تعطیل	صفات کا انکار یا مفہوم ختم کرنا	مردود، اثبات کے خلاف
بے حد تاویل	ہر صفت کو دوسرے معنی میں ڈھالنا	احتیاط لازم، اصل سے انحراف کا خطرہ
اہل سنت کا اعتدال	اثبات بلا تشبیہ، تنزیہ بلا تعطیل	قرآنی اصول کے مطابق متوازن راہ

تاویل کے بارے میں اہل سنت کے ہاں دو بڑی صورتیں ملتی ہیں۔ متقدمین اہل حدیث کا غالب رجحان یہ رہا کہ نصوص کو ظاہر پر ثابت مان کر کیفیت کی تفویض کر دی جائے اور تاویل سے احتیاط برتی جائے۔ بعد کے اشعری و ماتریدی متکلمین نے بعض نصوص میں زبان و سیاق کی بنیاد پر تاویل کو بھی جائز رکھا تاکہ عوام تشبیہ میں نہ پڑیں۔ دونوں رجحانوں

کا مقصد ایک ہی تھا یعنی تنزیہ کی حفاظت اور اثبات کا اقرار، البتہ طریقے میں تفصیل کا اختلاف ہوا۔ طالب علم کے لیے درست تعلیمی رویہ یہ ہے کہ اس اختلاف کو فرقہ وارانہ جھگڑے کے بجائے علمی تاریخ کے طور پر پڑھے اور کسی ایک جزئی مسئلے میں کسی عالم یا گروہ پر حکم لگانے سے پرہیز کرے، کیونکہ اس باب میں فتویٰ و تکفیر جیسے معاملات اہل علم و مجاز اداروں سے متعلق ہیں۔

صفات ذاتیہ وفعلیہ اور کلام کا مسئلہ

اہل سنت نے صفات کو سمجھنے کے لیے ان کی درجہ بندی بھی کی ہے۔ صفات ذاتیہ وہ ہیں جو ذات کے ساتھ ہمیشہ قائم رہتی ہیں، جیسے حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، ارادہ اور کلام۔ صفات فعلیہ وہ ہیں جو اللہ کے افعال سے متعلق بیان ہوتی ہیں، جیسے تخلیق، رزق دینا، معاف کرنا یا عذاب دینا، جن کا تعلق اس کی مشیت سے ہے۔ اس درجہ بندی سے بہت سی الجھنیں دور ہوتی ہیں کیونکہ ہر صفت کا دائرہ واضح ہو جاتا ہے۔ اسی ذیل میں کلام اللہ کا مسئلہ علم الکلام کی مشہور بحثوں میں سے ہے جس میں اہل سنت نے کلام کو اللہ کی صفت ثابت مانا اور اس باب میں پیدا ہونے والے اعتراضات کے تفصیلی جوابات دیے۔ یہاں اس طویل بحث کا خلاصہ ہی درکار ہے کہ اہل سنت نے نصوص کے اثبات کو بھی قائم رکھا اور عقلی اعتراضات کا جواب بھی دیا۔

اہل سنت کے منہج کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ صفات کو ذات سے بالکل الگ خود مختار ہستیاں بھی نہیں مانا گیا اور ذات کا عین کہہ کر ان کا انکار بھی نہیں کیا گیا۔ متکلمین کی مشہور تعبیر میں صفات نہ ذات کا عین ہیں نہ غیر، اس سے مقصد یہ تھا کہ تعدد قدماء کا اعتراض بھی دور ہو اور صفات کا مفہوم بھی محفوظ رہے۔ اس قسم کی اصطلاحی بحثیں عام قاری کو مشکل لگ سکتی ہیں مگر ان کا مقصد سادہ ہے: اللہ کی وحدانیت بھی قائم رہے اور اس کے کمالات بھی ثابت رہیں۔ یہی وہ توازن ہے جس نے اہل سنت کے منہج کو صدیوں تک امت کے غالب علمی منہج کے طور پر برقرار رکھا اور اسے تشبیہ و تعطیل دونوں انتہاؤں سے محفوظ رکھا۔

منہج کے عملی ثمرات

اس منہج کے عملی ثمرات بھی قابل غور ہیں۔ عقیدے کی سطح پر مومن کو ایک واضح اور پر اعتماد تصور ملتا ہے: اس کا رب کامل صفات والا ہے، اس جیسا کوئی نہیں، وہ سنتا و دیکھتا ہے اور اس کی رحمت و قدرت حقیقی ہے۔ عبادت کی سطح پر اس تصور سے دعا، خوف، امید اور محبت سب کو بنیاد ملتی ہے۔ علمی سطح پر یہ منہج نصوص کی حرمت بھی قائم رکھتا ہے اور عقل کو اس کے مناسب دائرے میں استعمال بھی کرتا ہے۔ سماجی سطح پر اس نے امت کو بڑی حد تک ان فتنوں سے بچایا جن میں صفات کی بحث پر تکفیر و تقاتل تک نوبت آ سکتی تھی، بشرطیکہ اس منہج کی اعتدال والی روح برقرار رکھی جائے۔ آج کے طالب علم کے لیے بھی سبق یہی ہے کہ اس باب میں ادب، احتیاط اور اہل علم کی طرف رجوع کو ہرگز نہ چھوڑا جائے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے باب میں اہل سنت کا منہج اثبات بلا تشبیہ اور تنزیہ بلا تعطیل کا منہج ہے۔ اس میں قرآن و سنت سے ثابت صفات کو حقیقتاً مانا جاتا ہے، مخلوق سے مشابہت کی قطعی نفی کی جاتی ہے، کیفیت کو اللہ کے علم پر چھوڑا جاتا ہے، اور تاویل کے معاملے میں زبان و سیاق اور سلف کے فہم کی رعایت کے ساتھ اندرونی علمی اختلاف کو علمی دائرے میں رکھا جاتا ہے۔ صفات ذاتیہ و فعلیہ کی درجہ بندی اسی منہج کی توضیح ہے۔ اس اعتدال نے اہل سنت کو تشبیہ اور تعطیل دونوں سے بچایا اور ایک ایسا تصور الٰہ قائم رکھا جو عبادت، اخلاق اور زندگی کے لیے قابل عمل ہے۔ مزید تفصیل کے لیے نصابی کتاب کے متعلقہ یونٹ اور مستند شروح کا مطالعہ اس خلاصے کی تکمیل کرے گا۔

سوال نمبر3: مسئلۂ تقدیر میں انسانی اختیار کی معقول توجیہ کیا ہے؟(20)

تعارف

تقدیر کا مسئلہ علم الکلام کے مشکل ترین اور قدیم ترین مسائل میں سے ہے۔ ایک طرف قرآن و سنت میں اللہ کے علم، قدرت اور مشیت کا احاطہ ثابت ہے کہ کائنات میں کوئی واقعہ اس کے علم و اذن سے باہر نہیں۔ دوسری طرف انسان کو احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، اسے نیکی و بدی میں انتخاب کی ذمہ داری دی گئی ہے اور جزا و سزا اسی انتخاب پر رکھی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سب کچھ مقدر ہے تو انسان کا اختیار کہاں رہا، اور اگر انسان مکمل آزاد ہے تو اللہ کی قدرت و علم کا احاطہ کیسے قائم رہے گا۔ اس جواب میں جبر و تفویض کی انتہاؤں، اہل سنت کی معقول توجیہ خصوصاً کسب کے تصور، اور اس توجیہ کے عملی نتائج کو بیان کیا جائے گا۔ یہ محض خالص علمی ہے؛ کسی فرد کی زندگی کے واقعات پر تقدیر کا اطلاق یا اس سے احکام اخذ کرنا اہل علم کا کام ہے۔

اس مسئلے کی عملی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ تقدیر کو غلط سمجھنے سے دو طرح کے خراب نتائج نکلتے ہیں۔ ایک طرف وہ سستی و بے عملی ہے جس میں انسان اپنی کوتاہیوں کو تقدیر کا نام دے کر کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ بے چینی و مایوسی ہے جس میں انسان ہر نقصان پر خود کو یا دوسروں کو مکمل قصوروار سمجھ کر نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ درست توجیہ انسان کو کوشش پر بھی قائم رکھتی ہے اور نتیجے پر صبر و رضا بھی سکھاتی ہے۔ تاریخ میں جبریہ نے انسان کو مکمل مجبور قرار دیا اور قدریہ و معتزلہ نے انسان کو اپنے افعال کا خالق کہنے تک بات پہنچائی۔ اہل سنت نے ان کے درمیان وہ راہ اختیار کی جس میں نصوص کے دونوں پہلو محفوظ رہتے ہیں۔ اسی راہ کو معقول توجیہ کہا جاتا ہے۔

جبریہ و قدریہ: دو انتہائیں

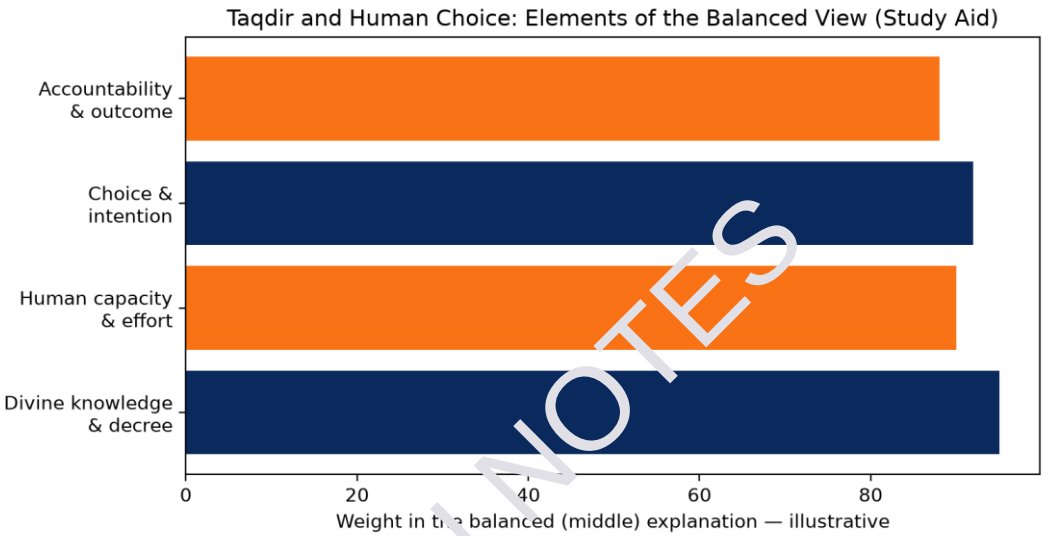
جبریہ کا موقف یہ تھا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے؛ جس طرح تیز ہوا میں پتا حرکت کرتا ہے اسی طرح انسان حرکت کرتا ہے اور اس کا ارادہ کوئی حقیقی اثر نہیں رکھتا۔ اس موقف سے اللہ کی قدرت تو بظاہر محفوظ ہوتی ہے مگر تکلیف، ثواب و عذاب اور قانون و اخلاق کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ اگر انسان واقعی مجبور محض ہو تو اسے نیکی کا حکم دینا اور بدی پر سزا دینا عدل کے ظاہر مفہوم سے خالی ہو جاتا۔ اس کے مقابلے قدری رجحان نے کہا کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے اور اللہ کا ان میں کوئی دخل نہیں۔ اس موقف

سے انسانی اختیار تو محفوظ ہوا مگر اللہ کے علم و قدرت کے احاطے میں کمی لازم آئی اور وحی کی بہت سی نصوص کی تاویل کرنا پڑی۔ دونوں مواقف جزوی سچ کو کل بنا کر غلطی میں پڑے۔

جدول: مسئلہ تقدیر میں اہم مواقف

بنیادی مشکل	انسانی اختیار	موقف
تکلیف و جزا کا مفہوم ختم	اختیار کی نفی، انسان مجبورِ محض	جبریہ
اللہ کے احاطہ علم و قدرت میں کمی	انسان افعال کا خالق، مکمل آزادی	قدریہ / تفویض
نصوص کے دونوں پہلو محفوظ	خلق اللہ کی طرف، کسب بندے کی طرف	اہل سنت کا توسط

ان انتہاؤں کی تاریخ سے ایک اہم علمی سبق بھی نکلتا ہے کہ مشکل مسائل میں جزوی دلیل کو پوری حقیقت قرار دینا فتنہ پیدا کرتا ہے۔ جبریہ نے قدرت والی نصوص لیں اور اختیار والی نصوص کو نظر انداز کیا؛ قدریہ نے اختیار والی نصوص لیں اور قدرت والی نصوص کی ایسی تاویلیں کیں کہ اصل مفہوم دب گیا۔ اہل سنت کی روش اس کے برعکس جمع کی روش ہے کہ تمام نصوص کو ان کے مقام پر رکھا جائے۔ یہی روش کلام کے ہر مشکل مسئلے میں اختیار کرنا طالب علم کے لیے مفید ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس مسئلے کی آخری گہرائی انسانی عقل کی حد سے آگے بھی جاتی ہے؛ بہت سے ائمہ نے اس باب میں غوطہ زنی کے بجائے ایمان و تسلیم کے ساتھ عملی زندگی پر توجہ کی تلقین کی ہے۔



شکل: تقدیر و اختیار کی متوازن توجیہ کے عناصر (مطالعے کے لیے تمثیلی خاکہ)

اہل سنت کی توجیہ: خلق و کسب کا فرق

اہل سنت اشاعرہ و ماتریدیہ کی معروف توجیہ خلق و کسب کے فرق سے بیان کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق افعال کا خالق اللہ ہے کیونکہ وجود میں آنے والی ہر چیز اسی کی قدرت سے وجود پاتی ہے، اور بندہ ان افعال کا کاسب ہے کیونکہ وہ اپنی دی گئی قدرت و ارادے سے ان کا قصد و اختیار کرتا ہے۔ کسب سے مراد وہ نسبت ہے جس کی بنیاد پر عمل بندے کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس پر وہ جواب دہ ٹھہرتا ہے۔ ہاتھ کی حرکت دونوں صورتوں میں حرکت ہے؛ رعشے والے ہاتھ کی بے ارادہ حرکت پر کوئی شخص جواب دہ نہیں ہوتا جبکہ یہی حرکت ارادے سے ہو تو اس پر اخلاقی و قانونی حکم لگتا ہے۔ فرق حرکت کے وجود میں نہیں، اس کی نسبت و اختیار میں ہے۔ یہی باریک فرق جبر و آزادی دونوں کے دلائل کو ان کی جگہ پر رکھتا ہے۔

اس توجیہ کو ایک اور زاویے سے بھی سمجھایا گیا ہے کہ اللہ کا علم واقعے کا تابع ہے، واقعہ علم کا تابع نہیں۔ اللہ کا کسی عمل کو ازل سے جاننا اس عمل کو مجبوری نہیں بنا دیتا، جس طرح ہم کسی کو اپنی مرضی سے کام کرتے دیکھ کر اس کا پہلے سے اندازہ لگا لیں تو ہمارا جاننا اسے مجبور نہیں کرتا۔ اسی طرح قوانین فطرت اور اسباب کا نظام بھی اختیار کے منافی نہیں

ہے؛ انسان اسباب کے اندر رہ کر انتخاب کرتا ہے۔ بارش کا مقدر ہونا کسان کو ہل چلانے سے نہیں روکتا۔ درحقیقت اسلامی تعلیم میں اسباب اختیار کرنا خود تقدیر ہی کا حصہ سمجھا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تدبیر، منصوبہ بندی اور اسباب کا مکمل اہتمام اس کی عملی دلیل ہے کہ تقدیر پر ایمان کبھی بے عملی کا نام نہیں رہا۔

وجدان، تکلیف اور قانونی ذمہ داری کی گواہی

معقول توجیہ کی ایک دلیل انسان کا اپنا وجدان ہے۔ ہر شخص اپنے اندر مجبورانہ افعال اور اختیاری افعال کا فرق محسوس کرتا ہے۔ آنکھ جھپکنا، دل دھڑکنا اور لرزہ طاری ہونا اس کے اختیار میں نہیں، جبکہ لکھنا، چلنا اور بولنا اس کے ارادے سے ہوتا ہے۔ اس داخلی تجربے کو جھٹلانا روزمرہ زندگی کے پورے نظام کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ عالمی سطح پر قوانین، عدالتیں اور تعلیمی نظام اسی مفروضے پر چلتے ہیں کہ انسان اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اگر جبر محض درست ہوتا تو مجرم و بے گناہ کا فرق ختم ہو جاتا اور معذور و مجبور کو چھوٹ دینے کا اصول ہی بے معنی ہو جاتا۔ اسلام نے مجبوری، نابالغی اور پاگل پن کی صورتوں میں تکلیف اٹھا کر اسی وجدانی فرق کو شریعت میں بھی تسلیم کیا ہے۔

اس مقام پر ایک باریک سوال اٹھتا ہے کہ اگر اللہ کو پہلے سے معلوم ہے کہ بندہ کیا کرے گا تو بندے کا اس کے خلاف کرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ متکلمین نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اللہ کا علم بندے کے اختیار کے عین مطابق ہے؛ وہ جانتا ہے کہ بندہ اپنے اختیار سے یہ کرے گا، نہ یہ کہ وہ اسے مجبور کر کے کرائے گا۔ علم کا تعلق معلوم کے ہونے سے ہے، اسے پیدا کرنے سے نہیں۔ اسی طرح اللہ کی مشیت کا احاطہ اس بات سے ہے کہ کوئی چیز اس کے اذن و قدرت کے دائرے سے باہر وجود نہیں پا سکتی، مگر اس دائرے کے اندر بندے کو جو قدرت و ارادہ دیا گیا ہے وہ حقیقی ہے، فرضی نہیں۔ اس فرق کو برقرار رکھنے سے نہ قدرت الٰہی محدود ہوتی ہے اور نہ انسانی ذمہ داری ختم ہوتی ہے، اور یہی اہل سنت کی توجیہ کا حاصل ہے۔

عملی ثمرات: کوشش، صبر اور توازن

اس توجیہ کے عملی ثمرات بڑے واضح ہیں۔ ماضی کے بارے میں تقدیر کا عقیدہ صبر و رضا سکھاتا ہے کہ جو نقصان اسباب کی پوری کوشش کے بعد پہنچا اس پر بے جا کڑھنے کے بجائے اسے اللہ کی حکمت پر چھوڑا جائے اور آگے کا لائحہ عمل بنایا جائے۔ مستقبل کے بارے میں یہی عقیدہ کوشش و تدبیر سکھاتا ہے کیونکہ نتیجہ معلوم نہیں اور اسباب اختیار

کرنا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح تقدیر سستی کا بہانہ نہیں بلکہ نفسیاتی توازن کا نظام ہے۔ مسلمان کسان، تاجر، سپاہی اور طالب علم تاریخ میں اسی لیے سرگرم رہے کہ ان کے نزدیک محنت عبادت بھی ہے اور تقدیر اس کی نفی نہیں کرتی۔ جو شخص ناکامی پر تقدیر کو ڈھال اور محنت سے فرار کا ذریعہ بناتا ہے وہ دراصل عقیدے کو اس کے عملی سیاق سے کاٹ کر غلط استعمال کرتا ہے۔

آخر میں یہ احتیاط بھی اس توجیہ کا حصہ ہے کہ تقدیر کے نام پر نہ گناہ کا جواز بنایا جائے اور نہ دوسروں کے مصائب پر فتوے لگائے جائیں۔ کسی مریض، مقروض یا مصیبت زدہ کو یہ کہنا کہ یہ تمہارے عمل کا طے شدہ نتیجہ ہے، اخلاقاً بھی درست نہیں اور علمی طور پر بھی کیونکہ غیب کا علم کسی کے پاس نہیں۔ شریعت نے ظاہر احکام کو اختیار و اسباب سے جوڑا ہے اور باطن و تقدیر کو اللہ کے سپرد کیا ہے۔ اسی حد بندی سے عقیدہ بھی محفوظ رہتا ہے اور انسانی ہمدردی بھی۔ علم الکلام کی اس مشہور بحث کا یہ عملی خلاصہ طالب علم کو نظری بحث سے آگے بڑھ کر زندگی میں لے آتا ہے اور یہی اس سوال کا اصل مقصد ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ تقدیر میں معقول توجیہ اہل سنت کا متوسط موقف ہے: افعال کی تخلیق اللہ کی قدرت سے ہے اور ان کا کسب و اختیار بندے کی طرف حقیقی ہے، اسی کسب پر تکلیف، ثواب و عذاب اور قانونی ذمہ داری قائم ہے۔ اللہ کا ازلی علم و مشیت کا احاطہ بندے کو مجبور محض نہیں بناتا، کیونکہ علم واقعے کو پیدا نہیں کرتا اور دی گئی قدرت کے اندر انتخاب حقیقی ہوتا ہے۔ جبریہ نے اختیار کو اور قدریہ نے قدرت کو قربان کیا جبکہ توسط نے نصوص کے دونوں پہلو جمع کر دیے۔ اس توجیہ کا عملی پھل کوشش، اسباب کی اختیار کردگی، نتیجے پر صبر اور گناہ و سستی کے لیے تقدیر کو بہانہ نہ بنانا ہے۔ اس باب کی آخری گہرائیوں میں ایمان و تسلیم کے ساتھ اہل علم کی رہنمائی ہی طالب علم کے لیے محفوظ راہ ہے۔

سوال نمبر 4: جدید علم الکلام کن نئے فکری سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے؟(20)

تعارف

علم الکلام اسلام کا وہ علم ہے جو عقائد کا عقلی دفاع کرتا ہے۔ مخالف دلائل کا جواب دیتا ہے اور ایمان کو فکری بنیادوں پر منظم کرتا ہے۔ قدیم علم الکلام نے اپنے دور کے سوالات کا جواب دیا تھا: صفات کا مسئلہ، جبر و قدر، خلق قرآن اور یونانی فلسفے کے اعتراضات۔ جدید دور میں انسان کے سامنے بالکل نئے فکری چیلنج آ گئے: سائنس کی حیران کن ترقی، الحاد کی نئی صورتیں، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، مغربی فلسفے کی تحریکیں، اجتہادی و سماجی تبدیلیاں اور میڈیا کا تہذیبی یلغار۔ جدید علم الکلام انہی نئے سوالات کے تناظر میں عقائد کی از سر نو عقلی تعبیر و دفاع کی کوشش ہے۔ اس جواب میں ان سوالات کو شعبوں کے لحاظ سے بیان کیا جائے گا اور جدید کلام کے طریقہ کار کی خصوصیات بھی واضح کی جائیں گی۔

جدید علم الکلام کی ضرورت کو سمجھنے کے لیے یہ فرق واضح رکھنا چاہیے کہ عقائد کی اصل یعنی وحی تبدیل نہیں ہوتی، مگر سوالات کی زبان، اعتراضات کی صورت اور مخاطب کا ذہن بدل جاتا ہے۔ قدیم مخاطب ارسطو کی منطق اور فطرت کے قدیم تصورات میں سوچتا تھا؛ آج کا مخاطب ارتقا، نفسیات، کاسمولوجی اور انٹرنیٹ کے تصورات میں سوچتا ہے۔ اگر اسے اسی کی زبان میں جواب نہ دیا جائے تو وہ دین کو اپنے دور سے غیر متعلق سمجھنے لگتا ہے۔ علامہ اقبال کی تجدید فکریات دین، مصر و برصغیر کے متعدد مفکرین کی کلامی کوششیں اور ترکی و عرب دنیا کی جدید کلامی ادبیات اسی ضرورت کا جواب ہیں۔ البتہ جدید کلام کی ہر کوشش کو یکساں قبول نہیں کیا گیا؛ بعض تعبیرات پر اہل سنت کے علما نے نقد بھی کیا ہے۔ تعلیمی رویہ یہی ہے کہ سوالات کو پوری طرح سمجھا جائے اور جوابات کا جائزہ اصولوں کی روشنی میں لیا جائے۔

سائنس سے پیدا ہونے والے سوالات

جدید علم الکلام کا پہلا بڑا میدان سائنس کے سوالات ہیں۔ کائنات کی ابتدا کے بارے میں بگ بینگ جیسے نظریات نے خالق کے سوال کو نئی زبان دی ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ طبعی قوانین کی دریافت کے بعد خدا کی ضرورت ختم ہو گئی، جبکہ جدید متکلمین کہتے ہیں کہ قوانین کا وجود خود توجیہ طلب ہے اور سائنس طریقہ کار بتاتی ہے، علت اولیٰ کا جواب نہیں دیتی۔ اسی طرح نظریہ ارتقا نے انسان کی تخلیق کے روایتی فہم پر سوالات اٹھائے۔ جدید کلام اس میدان میں سائنس کے مسلمہ نتائج اور ان پر بنائے گئے فلسفیانہ

الحادی نتائج میں فرق کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تجرباتی علم اور اس کی مابعد الطبیعی تعبیر ایک چیز نہیں۔ مصنوعی ذہانت اور جینیاتی سائنس نے بھی روح، شعور اور انسانی انفرادیت کے نئے سوالات کھڑے کر دیے ہیں جن کا جواب کلامی فکر کے بغیر ممکن نہیں۔

جدول: جدید علم الکلام کے اہم سوالی شعبے

کلام کا کام	نمونہ سوال	شعبہ
علم و فلسفی تعبیر کا فرق واضح کرنا	قوانین فطرت کے لیے خالق کی ضرورت؟	سائنس
شر کی حکمت و آزمائش کی توجیہ	شر کے مسئلے سے خدا کا انکار؟	الحاد جدید
توحید و وحی کے دعوے کا عقلی جائزہ	تمام مذاہب برابر ہیں؟	مذاہب کا مطالعہ
فلاح و قدر کے معیار کی بحث	وحی کے بغیر اخلاق ممکن ہے؟	اخلاقیات
مقاصد و اصول کی روشنی میں اجتہادی گفتگو	ریاست، حقوق، خواتین کے سوالات؟	جدید سماج
معنی، موت و آخرت کا جواب	زندگی بے مقصد ہے؟	نفسیات و وجودیت

سائنس کے شعبے میں جدید کلام کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ سائنس سے دشمنی نہ کی جائے اور نہ ہی اسے دین کا متبادل بنایا جائے۔ سائنس اپنے دائرے کی بادشاہ ہے مگر اس کا دائرہ قابل پیمائش مظاہر تک محدود ہے۔ مقصد، قدر اور غیب کے سوالات اس کے آلات سے ناپے نہیں جا سکتے۔ جدید متکلم اسی حد بندی کو سائنسی مثالیں دے کر واضح کرتا ہے: کائنات کی باریک ترتیب، قوانین کی ریاضیاتی ہم آہنگی اور شعور کا معمہ ایسے نکات ہیں جہاں سائنس کے اندر سے بھی مابعد الطبیعی سوال اٹھتا ہے۔ اس انداز سے جواب سننے والا سائنس پڑھا نوجوان یہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے سائنس اور ایمان میں سے ایک چننا پڑے گا، بلکہ اسے دونوں کے دائرے الگ الگ نظر آتے ہیں۔ یہی انداز اگلے سوال میں مذہب و سائنس کے تعلق کے تحت بھی تفصیل سے آئے گا۔

الحاد، شر کا مسئلہ اور مذہبی کثرتیت

دوسرا بڑا میدان جدید الحاد کے سوالات ہیں۔ نئے ملحدین میڈیا و ادب کے ذریعے دین کو سائنس مخالف، تشدد کا سبب اور ترقی کی رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مشہور اعتراضات میں شر کا مسئلہ سب سے نمایاں ہے کہ اگر خدا رحیم و قادر ہے تو زلزلے، بیماریاں اور ظلم کیوں ہیں۔ جدید علم الکلام اس سوال کا جواب کئی سطحوں پر دیتا ہے: دنیا دار ابتلا ہے مکمل جزا کی جگہ نہیں، بہت سا شر انسانی اختیار کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے، طبیعی شر کے پس منظر میں قوانین فطرت کا وہ نظام ہے جس کے بغیر زندگی ممکن نہیں، اور محدود انسانی علم پوری حکمت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ان جوابات کی تفصیل نصابی مواد میں موجود ہے؛ یہاں مقصد یہ دکھانا ہے کہ جدید کلام پرانے سوال کو نئی شدت کے ساتھ دوبارہ لیتا ہے۔

تیسرا میدان مذاہب کی کثرتیت کا سوال ہے۔ عالمی رابطوں کے بعد ہر مذہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے سامنے ہیں اور یہ سوال عام ہو گیا ہے کہ نجات و سچائی کسی ایک دین کے ساتھ خاص ہے یا سب راستے برابر ہیں۔ جدید کلام اس سوال پر اسلام کے دعویٰ توحید و ختم نبوت کی عقلی و تاریخی بنیاد بیان کرتا ہے، دوسرے مذاہب کے ساتھ مکالمے کا ادب سکھاتا ہے اور زبردستی کے بجائے دلیل و اخلاق سے دعوت کا طریقہ واضح کرتا ہے۔ اسی سے جڑا ہوا سوال وحی و عقل کے تعلق کا ہے جس پر جدید مسلم مفکرین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ طالب علم کے لیے ان مباحث کو پڑھتے وقت دو احتیاطیں لازم ہیں: ایک یہ کہ دوسرے مذاہب کے بارے میں معلومات مستند ذرائع سے لی جائیں، اور دوسری یہ کہ اعتقادی احکام کے اطلاق میں علما کی رہنمائی کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

انسان، اخلاق اور جدید سماجی سوالات

چوتھا میدان انسان اور اخلاق کے جدید سوالات ہیں۔ جدید نفسیات نے ضمیر، لاشعور اور جبلتوں کی بحث سے انسانی ذمہ داری پر سوال اٹھایا۔ وجودیت نے زندگی کو بے مقصد قرار دے کر خدا کے بعد معنی کے بحران کو شدید کر دیا۔ صارفیت نے انسان کو محض خریدار بنا دیا۔ جدید علم الکلام ان سب کے مقابلے میں اسلامی تصور انسان پیش کرتا ہے کہ انسان خلیفہ ہے، اسے اختیار و امانت دی گئی ہے، اس کی زندگی بامقصد ہے اور موت کے بعد جواب دہی ہے۔ اخلاقیات کے شعبے میں بائیو ایتھکس کے مسائل، جیسے زندگی و

موت کے طبی فیصلے، اعضا کی پیوند کاری اور تولیدی ٹیکنالوجی، ایسے سوالات ہیں جن میں کلام و فقہ کو مل کر اصول دینے پڑتے ہیں۔ جدید کلام عموماً اصول و مقاصد کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور جزئی فقہی حکم فقہا کے سپرد کرتا ہے۔

پانچواں میدان سماجی و سیاسی سوالات ہیں۔ ریاست اور مذہب کا تعلق، جمہوریت و شورا کی بحث، انسانی حقوق کی زبان، خواتین کی تعلیم و معاشرتی کردار، اقلیتوں کے حقوق اور معاشی انصاف جیسے موضوعات پر جدید مسلمان سے مسلسل سوال ہوتا ہے۔ جدید علم الکلام ان سوالات میں اسلامی اصولوں یعنی عدل، شورا، امانت، انسانی کرامت اور ظلم کی ممانعت کو سامنے رکھ کر عصری اداروں کے ساتھ ان کا تعلق واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے اور یہی اختلاف علمی زندگی کی علامت ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس پوری گفتگو کا محرک خواہش نفس نہیں بلکہ وحی کے اصولوں کی روشنی میں عصر حاضر کے مسائل کو سمجھنا ہو۔ اسی لیے جدید کلام کو بعض مفکرین نے تجدید کہا ہے اور بعض نے اسے قدیم کلام کی توسیع؛ نام سے زیادہ اہم اس کی سمت ہے۔

جدید کلام کا طریقہ کار

جدید علم الکلام کا طریقہ کار بھی قدیم سے کسی قدر مختلف ہے۔ زبان آسان اور عصری ہے، مثالیں سائنس و سماج سے لی جاتی ہیں، مخاطب عمومی پڑھا لکھا نوجوان ہے اور ذرائع کتاب سے بڑھ کر لیکچر، میڈیا اور مکالمہ بھی ہیں۔ استدلال میں قدیم منطقی قیاس کے ساتھ تاریخی، نفسیاتی اور وجودی دلائل بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی جدید کلام کے سامنے دو خطرات بھی ہیں جن سے اس کے ناقدین خبردار کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ جدیدیت کی مرعوبیت میں عقائد کی ایسی تعبیر کر دی جائے جو ان کی اصل سے کٹ جائے۔ دوسرا یہ کہ دفاعی جذبے میں ہر جدید نظریے کو آنکھ بند کر کے رد کر دیا جائے۔ متوازن جدید کلام ان دونوں سے بچتا ہے؛ وہ سوال کو پوری قوت سے سنتا ہے، علم کے اصل نتائج کو قبول کرتا ہے اور وحی کے اصولوں پر قائم رہ کر جواب دیتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جدید علم الکلام سائنس و کاسمولوجی کے سوالات، جدید الحاد و شر کے مسئلے، مذہبی کثرتیت و مکالمے، انسان و شعور کے جدید نظریات، اخلاقی و طبی مسائل اور سماجی و سیاسی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقصد عقائد بدلنا نہیں بلکہ انہیں نئے ذہن کے لیے قابل فہم، مدلل اور زندہ بنانا ہے۔ اس کوشش کی کامیابی کا دارومدار اسی توازن پر ہے کہ اصول دین سے لیے جائیں اور زبان و دلائل عصر سے۔ طالب علم کے لیے اس سوال کا عملی حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے گرد اٹھنے والے فکری سوالات سے گھبرائے نہیں بلکہ انہیں منظم مطالعے اور اہل علم کی رہنمائی سے سمجھے، کیونکہ ہر دور کے سوالات کا جواب دینا ہی علم الکلام کی اصل روایت ہے۔

سوال نمبر 5: مذہب اور سائنس کے تعلق کی درست نوعیت کیا ہے؟ (20)

تعارف

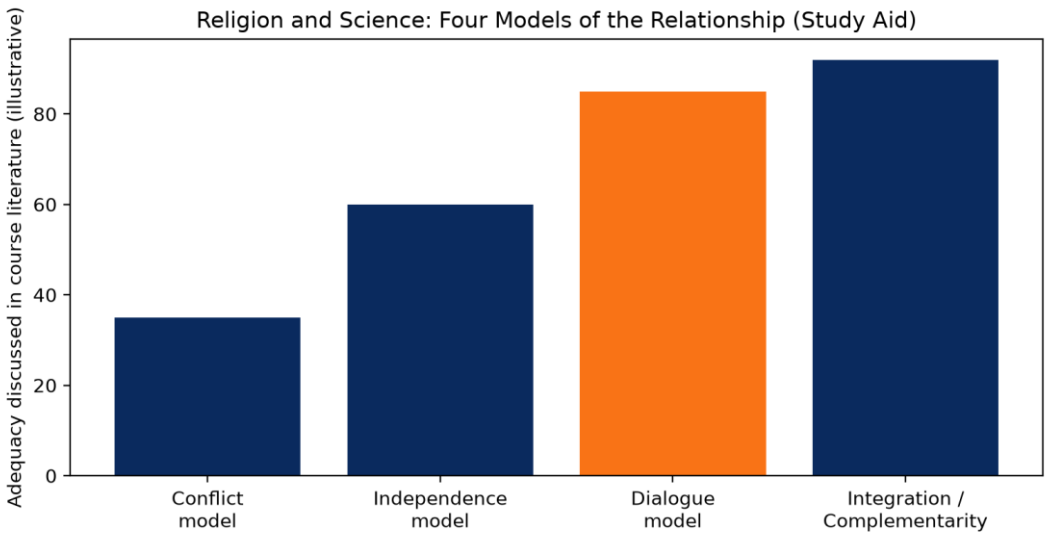
مذہب اور سائنس کے تعلق کا سوال جدید فکری مباحث میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ دونوں کو باہم متصادم قرار دیتے ہیں، بعض سائنس کو مذہب کا متبادل سمجھتے ہیں اور بعض مذہب کو سائنس کا موضوع بھی بنانا چاہتے ہیں۔ درست نوعیت کو سمجھنے کے لیے پہلے دونوں کے موضوع، طریقہ کار اور دائرے کو الگ الگ واضح کرنا ضروری ہے۔ سائنس مادی کائنات کے مظاہر کا مشاہدہ، تجربہ اور پیمائش سے مطالعہ کرتی ہے اور قابل آزمائش قوانین بناتی ہے۔ مذہب انسان کو خالق، مقصد، اخلاق اور آخرت کی رہنمائی دیتا ہے اور وحی کو علم کا ذریعہ مانتا ہے۔ جب دائرے الگ ہوں تو تصادم لازم نہیں آتا؛ تصادم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک فریق دوسرے کے دائرے میں مداخلت کرے۔ اس جواب میں تعلق کے مشہور نمونے، اسلام کا متوازن موقف اور عملی اصول بیان کیے جائیں گے۔

اس سوال کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کے ذہن میں یہ تاثر عام کیا گیا ہے کہ تاریخ میں مذہب نے ہمیشہ سائنس کی مخالفت کی اور سائنس نے مذہب کو غلط ثابت کیا۔ یہ تاثر تاریخی طور پر بھی یک طرفہ ہے اور نظری طور پر بھی۔ یورپ کے ایک خاص تاریخی تجربے کو تمام مذاہب و تہذیبوں پر عام کر دینا علمی انصاف

نہیں۔ اسلامی تہذیب میں صدیوں تک مذہبی اداروں کے سائے میں طب، فلکیات، ریاضی اور کیمیا نے ترقی کی۔ آج بھی مسئلہ سائنس اور مذہب کے اصولوں کا اتنا نہیں جتنا ان کی تعبیرات کا ہے۔ جدید علم الکلام کے پچھلے سوال سے جڑا ہوا یہ موضوع طالب علم کو وہ نقشہ دیتا ہے جس میں وہ اپنے ایمان اور اپنے عصری علم دونوں کو باوقار جگہ دے سکے۔

تعلق کے چار مشہور نمونے

مفکرین نے مذہب و سائنس کے تعلق کے چار نمونے بیان کیے ہیں۔ پہلا تصادم کا نمونہ ہے جس کے مطابق دونوں ایک ہی سوالوں کے نقیض جواب دیتے ہیں اس لیے ایک کا سچا ہونا دوسرے کا جھوٹا ہونا ہے۔ اس نمونے کی بنیاد پر ایک طرف سائنسی الحاد وجود میں آیا اور دوسری طرف سائنس دشمنی۔ دوسرا نمونہ مکمل علیحدگی کا ہے جس کے مطابق دونوں کی زبانیں اور دائرے اتنے الگ ہیں کہ ان کا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اس سے تصادم تو ختم ہو جاتا ہے مگر انسان کی زندگی دو خانوں میں بٹ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے کچھ سیکھ نہیں سکتے۔ تیسرا نمونہ مکالمے کا ہے جس میں دونوں اپنی حدود برقرار رکھتے ہوئے سوالات و نتائج پر گفتگو کرتے ہیں۔ چوتھا نمونہ تکمیل و ہم آہنگی کا ہے جس میں سائنس کائنات کے کیسے کا جواب دیتی ہے اور مذہب کیوں اور کس لیے کا، اور دونوں مل کر انسان کی کلی سمجھ کو مکمل کرتے ہیں۔



شکل: مذہب و سائنس کے تعلق کے چار نمونوں کا تقابلی جائزہ (مطالعے کے لیے تمثیلی خاکہ)

ان نمونوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تصادم کا نمونہ اکثر غلط فہمیوں پر قائم ہوتا ہے۔ سائنس کے تبدیل ہونے والے نظریات کو اس کی آخری سچائی سمجھ لینا یا مذہبی نصوص کی ایک خاص تاریخی تعبیر کو خود مذہب قرار دے لینا تصادم پیدا کرتا ہے۔ علیحدگی کا نمونہ امن تو دیتا ہے مگر کائنات کی ابتدا، شعور اور اخلاق جیسے سرحدی سوالات پر رہنمائی نہیں دیتا جہاں دونوں کی گفتگو ضروری طور پر ہوتی ہے۔ اس لیے بیشتر مسلم مفکرین نے مکالمے اور تکمیل کے نمونوں کو درست نوعیت کے قریب قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک تعلق نہ جنگ کا ہے نہ بیگانگی کا، بلکہ دائرے کی تمیز کے ساتھ باہمی احترام و استفادے کا ہے۔ یہی موقف آگے اسلامی تناظر میں مزید واضح کیا جائے گا۔

جدول: سائنس اور مذہب کے دائرے کا تقابل

پہلو	سائنس	مذہب
موضوع	مادی مظاہر اور ان کے قوانین	خالق، مقصد، اخلاق، آخرت
طریقہ	مشاہدہ، تجربہ، پیمائش	وحی، عقل، روحانی تجربہ
سوال کی نوعیت	کیسے ہوتا ہے؟	کیوں ہے اور کیسے جینا چاہیے؟
تبدیلی	نظریات مسلسل بہتر ہوتے ہیں	اصول و عقائد ثابت رہتے ہیں
حد	قابلِ پیمائش سے آگے خاموش	طبیعی تفصیلات سائنس پر چھوڑتا ہے

تاریخی پہلو: اسلام اور سائنسی ترقی

تاریخی شواہد اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ مذہب بذاتِ خود سائنس کا دشمن نہیں رہا۔ قرونِ وسطیٰ کی مسلم تہذیب میں مسجد و مدرسے کے ساتھ رصد گاہیں اور بیمارستان قائم تھے۔ ابن الہیثم نے بصریات میں تجرباتی طریقہ استعمال کیا، البیرونی نے زمین و فلکیات کی پیمائشیں کیں، ابن سینا کی القانون صدیوں تک طب کی نصابی کتاب رہی اور خوارزمی کے نام سے الجبرا کی اصطلاح دنیا میں پھیلی۔ ان سائنس دانوں میں سے اکثر اپنے دور کے مذہبی علوم سے بھی واقف تھے۔ ان کا محرک خود دینی فکر بھی تھا کہ کائنات اللہ کی

نشانیوں کا مجموعہ ہے جس پر غور کرنا عبادت سے قریب عمل ہے۔ اس تاریخ کو نظر انداز کر کے مذہب و سائنس کی دشمنی کو آفاقی اصول قرار دینا درست نہیں۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض ادوار و مقامات پر تعبیرات کے اختلاف سے سائنس دانوں کو مشکلات پیش آئیں، جن کا جائزہ اسی تاریخی مخصوصیت کے ساتھ لینا چاہیے۔

یورپی تاریخ میں گلیلیو جیسے واقعات کو اکثر اس بحث میں مثال بنایا جاتا ہے۔ وہ واقعات کلیسائی ادارے کی اس وقت کی مخصوص تعبیر اور سیاسی طاقت کے پس منظر میں پیش آئے تھے۔ انہیں بنیاد بنا کر ہر مذہب کے بارے میں ایک ہی حکم لگانا علمی طور پر کمزور تعمیم ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں کوئی مرکزی کلیسائی ادارہ اس صورت میں موجود ہی نہیں رہا جو سائنسی تحقیق پر فتویٰ نافذ کرتا ہو؛ علم کی دنیا نسبتاً آزاد مکاتب و شخصیات کے ہاتھ میں رہی۔ اس فرق کی نشاندہی اس لیے ضروری ہے کہ طالب علم مغربی ادب سے منتقل شدہ تصادم کے بیانیے کو بغیر تنقید قبول نہ کرے۔ ہر تہذیب کے تجربے کو اسی کے تناظر میں سمجھنا ہی درست علمی رویہ ہے۔

اسلام کا متوازن موقف

اسلامی نقطہ نظر سے درست نوعیت یہ ہے کہ سائنس اور مذہب دونوں سچائی کے طالب ہیں مگر ان کے شعبے مختلف ہیں۔ کائنات اللہ کی تخلیق ہے اس لیے اس کا درست مطالعہ خالق کی قدرت کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے، اور وحی اسی خالق کی ہدایت ہے اس لیے دونوں میں اصلاً تعارض نہیں ہو سکتا۔ اگر بظاہر تعارض نظر آئے تو مسلم اہل علم نے دو امکان بیان کیے ہیں: یا سائنسی نظریہ ابھی حتمی نہیں، کیونکہ سائنس کی تاریخ نظریات کی تبدیلی سے بھری ہے، یا نص کی وہ تعبیر درست نہیں جو اختیار کی گئی ہے۔ اس اصول نے مسلمانوں کو سائنس کی اندھی دشمنی سے بھی بچایا اور ہر نئے نظریے کے سامنے عقیدے کو ڈھالنے سے بھی۔ شرط یہ ہے کہ قطعی نص اور قطعی علمی حقیقت میں فرق برقرار رکھا جائے اور دونوں طرف کے ماہرین اپنے شعبے کی اہلیت کے ساتھ بات کریں۔

اس موقف کے عملی اصول بھی واضح ہیں۔ اول یہ کہ سائنسی تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ طب، زراعت، توانائی اور ماحولیات میں اس کے بغیر انسانی فلاح ممکن نہیں۔ دوم یہ کہ سائنس کے اخلاقی استعمال کی رہنمائی مذہب سے لی جائے، کیونکہ سائنس بذات خود یہ نہیں بتا سکتی کہ اس کی طاقت کو انصاف سے استعمال کیا جائے یا ظلم کے لیے۔

ایٹمی طاقت، جینیاتی تبدیلی اور مصنوعی ذہانت کے دور میں یہ رہنمائی پہلے سے زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ سوم یہ کہ مذہبی گفتگو میں سائنسی معاملات کے بارے میں وہی بات اعتماد سے کہی جائے جو واقعی نصوص سے ثابت ہو، تاکہ کل کوئی نظریہ بدلنے سے دین کی ساکھ متاثر نہ ہو۔ یہی احتیاط درست تعلق کی ضمانت ہے۔

جدید دور کے عملی مسائل

آج کے عملی میدان میں اس درست تعلق کی آزمائش کئی جگہ ہو رہی ہے۔ ماحولیاتی بحران میں سائنس اعداد و شمار دیتی ہے کہ زمین گرم ہو رہی ہے اور انواع ختم ہو رہی ہیں، مگر انسانوں کو قربانی و ضبط پر آمادہ کرنے والا اخلاقی محرک مذہب فراہم کرتا ہے کہ زمین امانت ہے اور اسراف حرام ہے۔ وبائی امراض میں سائنس ویکسین و علاج دیتی ہے اور مذہب صبر، احتیاط اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچانے کی تعلیم دیتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں بہترین ماڈل وہ ہے جو طالب علم کو لیبارٹری کا تجربہ بھی دے اور مقصد زندگی کی سمت بھی۔ ان مثالوں سے صاف ہوتا ہے کہ جدید مسائل کا حل دونوں میں سے کسی ایک کو ختم کرنے میں نہیں بلکہ دونوں کے درست تعلق کو قائم کرنے میں ہے۔

آخر میں اس سوال کا خلاصہ اس نکتے پر جمع ہوتا ہے کہ تعلق کی درست نوعیت نہ تصادم ہے نہ متبادل ہونا۔ سائنس مذہب کی جگہ نہیں لے سکتی کیونکہ مقصد، قدر اور آخرت اس کے موضوع ہی نہیں، اور مذہب کو سائنس کی نصابی کتاب بھی نہیں بنانا چاہیے کیونکہ طبیعی تفصیلات اس کا موضوع نہیں۔ دونوں اپنے دائرے میں مستند ہیں اور سرحدی سوالات پر مکالمہ رکھتے ہیں۔ یہی نوعیت فرد کو متکبر سائنس پرستی سے بھی بچاتی ہے اور سائنس دشمن جمود سے بھی۔ مسلمان طالب علم کے لیے اس کا پیغام یہ ہے کہ وہ سائنس کو شوق سے پڑھے، اس کے طریقے کو اپنائے اور اس کے نتائج کو وحی کی رہنمائی میں انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کرے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کے تعلق کی درست نوعیت دائروں کی تمیز کے ساتھ مکالمہ و تکمیل کی ہے۔ سائنس مادی کائنات کے کیسے کا مطالعہ ہے اور مذہب خالق، مقصد، اخلاق اور آخرت کی رہنمائی ہے۔ تصادم کا بیانیہ تاریخی مخصوصیت اور تعبیرات کی غلطیوں سے پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ مسلم تہذیب کی سائنسی تاریخ سے ثابت ہے۔ اسلامی

موقف یہ ہے کہ حقیقی سچائیوں میں تعارض نہیں ہوتا؛ بظاہر تعارض کی صورت میں یا تو نظریہ غیر حتمی ہوتا ہے یا تعبیر قابل نظر ثانی ہوتی ہے۔ اس اصول پر قائم معاشرہ سائنس کی طاقت کو اخلاق کی رہنمائی سے جوڑ کر ترقی بھی کرتا ہے اور اپنی روح بھی برقرار رکھتا ہے، اور یہی توازن عصر حاضر کی سب سے بڑی فکری ضرورت ہے۔

USMAN NOTES
www.usmannotes.com